

جب دنیا بھی نئی تھی، جب آسمان تازہ تھا اور زمینِ ابھی میلی نہیں ہوئی تھی، جب
درخت صدیوں میں سانس لیتے تھے اور پرندوں کی آوازوں میں جگ بولتے تھے کتنا جران ہوتا
تھا وہ اور گہر دکودیکھ کر کہ ہر چیز کتنی نئی تھی اور کتنی قدیم نظراتی تھی۔ نیل کنٹھ کھٹ بڑھیا، مور،
فاختہ، گھری، طوطے جیسے سب اس کے شگ پیدا ہوتے تھے، جیسے سب جگوں کے بھیدنگ
لئے پہرتے ہیں۔ مور کی بھیدکا لگانڈر پتگھر کے جھگل سے نہیں بندابن سے آ رہی ہے کھٹ
بڑھیا اڑتے اڑتے اونچے نیم پا اتر قی تو دکھاتی دنیا کہ وہ ملکہ سبا کے محل میں خط پھوٹ کے آ رہی
ہے اور حضرت سیخان کے قلعے کی طرف جا رہی ہے اور جب گھری منڈپ پر دوڑتے دوڑتے
اچانک دُم پہ کھڑی ہو کے چک چک کر قی تو وہ اسے مکنے لگتا اور حیرت سے سوچتا کہ اس کی
پیٹھ پر پڑی یہ کالی دھاریاں دام پندر جی کی انگلیوں کے نشان ہیں اور یہ تھی توجہت کا یہک
جمان تھا۔ اپنی ٹیلوٹھی میں کھڑے ہو کر جب وہ اسے دوڑ سے آتا دیکھتا تو بالکل ایسا لگتا کہ
پھاٹپلا آ رہا ہے۔ یہ بی سونڈ بڑے بڑے کان پکھوں کی طرح ہلتے ہوئے تلوار کی طرح خم
کھاتے ہوتے دوسنید سقید دانت دو طرف نکلتے ہوتے۔ اسے دیکھ کے وہ جیران اند آتا
اور سید جباری اماں کے پاس پہنچتا۔

”بی اماں، ہم تھی پہلے اڑا کرتے تھے؟“

”اسے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔“

” بھگت جی کہہ رہے تھے۔ ”

” ارے اس بھگت کی عقل پر تو پتھر پڑنے ہیں۔ لو بھلا بھم شیخم جا تو، وہ ہوا میں کیسے اٹ سے گا۔ ”

” بی اماں ہا بھتی پیدا کیسے ہوا تھا؟ ”

” کیسے پیدا ہوتا میتا تے چنا پیدا ہو گیا۔ ”

” نہیں بی اماں، ہا بھتی اندھے سے نکلا ہے۔ ”

” ارے تیری عقل چڑنے تو نہیں کی ہے؟ ”

” بھگت جی کہہ رہے تھے۔ ”

” بخت مارے بھگت کی قومت ماری گئی ہے۔ آتا بڑا جا تو کہا ہتھی کا ہتھی، وہ اندھے میں سے نکلے گا۔ لکھتا تو بعد کی بات ہے، اس میں سماںے گا کیسے۔ ”

گورے سے بھگت جی کے علم پر بہت اعیانہ تھا۔ سچے میں جنیو، لمحے پر تلاک، چھٹی کو چھوڑ کر سارا سر گھٹا ہوا۔ نون تسل کی دکان پر بیٹھے نون تسل بھی نیچتے جاتے اور راما آن اور رام بھارت بین کھی ہوتی حکمتیں بھی ساتھے جلتے۔ لڑکے باسے شور مچا رہے ہیں۔ ” بھگت جی ڈبڑھ پیسے کی سانچر، بھگت جی دھیلے کا گڑ۔ ”

” بالکروں مت چھاؤ۔ دھیرج سے کام لو۔ کہتے کہتے سانچر تو لئے، گڑ دیتے اور پھروں ہیں سے جہاں سے چھوڑا تھا سراپکھڑ لیتے۔ ” بالکو، بہہاں جی تے بہ دیکھا تو شیش سے کہا کہ دیکھ شیش درھر تی اس سے ادھک ڈالوادھول ہے۔ تو واکی سہا تنا کہ شیش بولا مہاراج واکو اٹھا کے مو کے پھیں پر رکھ دو، پھروہ ٹک جاوے گی۔ بہہاں جی بولے کہ شیش تو درھر تی کے بھیتر چلا جا۔ شیش نے درھر تی میں ایک چھید دیکھا۔ واہیں ٹک گیا۔ درھر تی تلے پہنچ کے پھن پھیلایا اور درھر تی کو پھن پڑکا لیا۔ کھوے نے بہ دیکھا تو واکو چھتا ہوئی کہ شیش کی پوچھ تلے تو پانی، ہی پانی ہے۔ واتے شیش کی پوچھ تلے جا کے سہارا یا سو بالکو درھر تی شیش جی کے

بچن پر ملکی ہوتی ہے۔ شیش جی کچھو سے کی پیٹھ پر طکے ہوتے ہیں۔ جب کچھوا ہلتے ہے تو شیش جی
ہلتے ہیں۔ جب شیش جی ہلتے ہیں تو وہ رتی ہلتے ہے اور جھوپچال آؤتے ہے۔“
گلزار ایا جان زندہ کی وجہ کچھ اور ہی بتاتے تھے۔ حکیم بندے علی اور مصیب حسین روتے
اس کے پڑے کمرے میں اگر بیٹھتے جس کے نیچوں یعنی جھالہ والا نیکھا لکھ رکھ تھا اور اپنی
چھٹتے کے بر ابر چاروں طرف لگتی بنتی رہتا کسی جنگل کی یونتوں کے جوڑ سے نہ کسی فاختنے،
کسی گڑ سل نے اپنا اپنا گھوسلاینا کھاتا۔ دونوں ایا جان سے کتنے مشکل سوال کرتے
تھے اور ایا جان بلا تامل قرآن کی آئیں پڑھ کر اور حدیثیں سن کر سوالوں کے جواب
دیتے تھے۔

”مولانا اللہ تعالیٰ نے زین کو کیس پریدا کیا؟“

خود بلا تامل، پھر جواب دسوال کیا جائیں عبد اللہ الفصاری نے کہ قربان ہوں ہمارے
مان باپ حضور پر سے، زین کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کس نظر سے تکیب دیا۔ فرمایا تمدن
کے پھیلے سے۔ پوچھا تمدن کا چیلنا کس چیز سے بتایا؟ فرمایا؟ موج سے۔ پوچھا، موچ کس چیز
نے نکلی؟ فرمایا، پانی سے۔ پوچھا، پانی کہاں سے نکلا؟ فرمایا، دانہ مر وارید سے۔ پوچھا،
دانہ مر وارید کہاں سے نکلا؟ فرمایا، تاریکی سے۔ تب کہا جائیں عبد اللہ الفصاری نے
کہ صدقت یا رسول اللہ۔“

”مولانا زین کس چیز پر فائم ہے؟“

پھر دم بھر کئے تامل۔ پھر اسی خوش اسلوبی سے جواب ”سوال کیا سوال کرنے
وابستے کہ قربان ہوں یا حضرت میرے ماں باپ آپ پر سے۔ زین کو قرار کس سے ہے؟
فرمایا، کوہ قاف سے۔ پوچھا کوہ قاف کے گردگرد کیا ہے؟ فرمایا سات زینیں۔ پوچھاست
زمینوں کے گرد کیا ہے؟ فرمایا، اژدها۔ پوچھا اژدهے کے گرد کیا ہے؟ فرمایا، اژدها۔
پوچھا، یہ کے نیچے کیا ہے؟ فرمایا، نکاتے جس کے چار ہزار سیکھتے ہیں اور ایک سینگ

سے دوسرے سینگ تک کافا صلہ پاچ سویں کے سفر کا ہے جیسا تھا بحقیقت زمین کے اس کے دوستنگوں پر لٹکے ہوتے ہیں اور مچھر ایک اس کاٹے کے نھنوں کے روپ و بیٹھا ہے۔ کہ خوف سے اس کے وہ جنیں نہیں کہ سکتی۔ بس سینگ بدلتی ہے کہ اس سے زندگی آتا ہے۔ پوچھا، کھڑی ہے وہ کس چیز پر؟ فرمایا مچھلی کی پشت پر تب قائل ہوا سوال کرنے والا اور بولا صدقۃ یا رسول اللہ۔

ابا جان چپ ہوتے۔ مچھر اولے "حکیم صاحب! اس دنیا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مچھر گلتے سے نھنوں کے روپ و بیٹھا ہے۔ مچھر ہٹ جلتے تو مچھر دنیا کہاں ہوگی۔ تو ہم ایک مچھر کے رحم و کرم پیہیں، مگر نہیں جلتے اور غزوہ کرتے ہیں۔"

روز یہی یاتین، روز یہی کہا نیاں جیسے یہ گفت جی اور ابا جان مل کر اس کے لئے کائنات کی تقسیم کر رہے تھے۔ یہ یاتین سن سن کر اس کے تصور پر دنیا کی ایک تصویر ہیں گئی تھی۔ دنیا تو خیر پیدا ہو گئی مگر اس کے بعد کیا ہوا۔ روتین بہت بی بی حا۔ پیدا ہوئی ان کے آنسوؤں سے مندی اور سر مر۔ مگر پیٹ سے پیدا ہوتے ہاں اور قایل دو بیٹے اور آفیما ایک بیٹی چڑتے آفتاب چڑے اہناب۔ یہاں دیا ہاپنے بیٹی کو پھوٹے بلیٹے ہاں مل سے۔ تب اٹھائی قایل بنے بڑے بلیٹے قایل نے اور پھر اٹھائی کے مارا ہاں مل کو کہ مگریا وہ اس سے۔ تب اٹھائی قایل نے ہاں مل کی لاش اپنے کامنے ہے پر اور چکر کاٹا پوری زمین کا۔ اور گر اجس جس مقام پر خون ہاں مل کا، ہو گئی اس اس جگہ پر زمین شور۔ تب سوچ میں پڑ گیا قایل کہ کوئی کیا بھائی کی لاش کا کہ دکھنے لگے تھے لاش کے بوجھ سے اس کے کندھے۔ دیکھا اس کھڑی اس نے دو کوؤں کو کہ لٹڑھے تھے آپس میں اور بار ڈالا ایک نے دوسرے کو کھودی مارنے والے نے اپنی منقار سے زمین اور گاڑ کر اس میں مقتول کو جا بیٹھا درخت پر۔ تب افسوس کیا قایل نے کا اے خرابی میری، نہ ہو سکا مجھ سے اتنا کہ ہوؤں بیمار کو سے کے اور کوؤں دفن اپنے برادر کو۔ تب دفن کیا بھائی نے بھائی کو کسے کی مثال پر سو وہ تھی پہلی قبر کہ بنی روئے زمین پر

اور تھا وہ پہلا خون آدمی کا کہ ہوا آدمی کے ہاتھوں اور تھا وہ پہلا بھائی کہ مارا گیا بھائی کے ہاتھوں
— اس نے پلیے ورقوں والی وہ کتاب بت دکھر کے ابا جان کی کتابوں کی الماری میں اسی
جلدہ رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی، پھر سنی اماں کے پاس پہنچا۔

”بی اماں! ہمیں قابیل کا بھائی تھا؟“

”ہاں بیٹے! ہمیں قابیل کا بھائی تھا۔“

”پھر ہمیں کو قابیل نے قتل کیوں کیا؟“

”ٹوپیا خون جو سستیدہ ہو گیا تھا۔“

اس تے یہ ستا اور حیران ہوا، لگدا بہ اس کی سیڑت میں پڑ کا ہلکا ٹد بھی شامل تھا سیڑت
کے ستروں میں خوف کی پسلی لہروہ اٹھ کے بڑے کمرے میں گیا جہاں حسب دستور حسکیم
پندے علی اور صیب حسین بیٹے ابا جان سے سوال کر رہے تھے اور جواب سن رہے تھے۔ لگدے
اس وقت ابا جان دنیا کے آغاز سے زندہ بھر کر دنیا کے انجام پر پہنچ چکے تھے۔

”مولانا قیامت کب آئے گی؟“

”جب پھر مر جائے گا اور گاتے ہے خوف ہو جائے گی۔“

”چھر کب مر جائے گا اور گاتے کب پہنچ جو دن ہو گی؟“

”جب سورج مغرب سے نکلے گا۔“

”سورج مغرب سے کب نکلے گا؟“

”جب مرغی بانگ دہے گی اور مرغ انگ کا ہو جائے گا۔“

”مرغی کب بانگ دے گی اور مرغ انگ کو کون کا ہو گا؟“

”جب کلام کرنے والے چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمیے باقیں کریں گے۔“

”کلام کرنے والے کب چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمیے کب باقیں کریں گے۔“

”رجب حاکم نظام ہو جائیں گے اور رعایا خاک چاٹے گی۔“

۱۶

ایک جب کے بعد دوسرا جب، دوسرے جب کے بعد تیسرا جب یہ جوں کا عجیب
چکہ تھا۔ جب ہو گزر گئے، جب جوانے والے تھے۔ کب کب کے جب بھگت یہی کو یاد
تھے، اکب کے جب ایسا جان کے تصور میں منور تھے۔ ایسے لکھا کہ وینا جوں کا یہ است
سلسلہ ہے جب اور جب اور جب۔۔۔ مگر اب تصور کی ذوق ری اچانک سے ٹوٹ گئی۔
باہر ملند ہوتے نعروں کا شور اچانک اندر کیا اور اس کی یادوں کی لڑکی کو تستر پر کر گیا۔

اس نے اٹھ کر درپیچے سے جہاں کا اور سامنے والے میدان پر کہ کچو دنوں سے جلسہ گاہ
بنا ہوا تھا، ایک نظر ڈالی اور ان گفت سروں کو کٹ دیکھا۔ جلسہ گرم تھا اور اچانک نعرے
تلگے شروع ہو گئے تھے۔ دیکھ بند کر کے پھر کہہ سی پس آیا تھا اور کتاب کو والٹ پلت کر کے
دیکھتا اور یہ ماں تھاں سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ آخر صبح کے لئے لیکھ بھی تو پیار کرنا تھا لگر
کھڑکی بند ہو جانے کے باوجود نعروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ لکھڑی دیکھی، گیارہ بج رہے
ہیں۔ جلسہ اب شروع ہوا ہے۔ تو نہیں ختم کب ہو گا؟ کہیں پھر وہی کل کا چکر شروع نہ
ہو جاتے اور رات کی نیند حرام ہو جاتے۔ آج کل نوجیسوں میں یہی ہوتا ہے۔ گالی سے
شروع ہوتے ہیں اور کوئی پر ختم ہوتے ہیں۔ مگر کمال ہے وہ اپنے آپ پر ہی رن ہونے والا
باہر عینماں میں کہتا جاتا ہے، میں اندر سٹھاتا جاتا ہوں۔ کب کب کی یادیں آرہی ہی ہیں۔
اگلے پچھلے قصتے، بھولی بسری باتیں بیا دیں ایک کے ساتھ دوسری، دوسری کے ساتھ تیسری
اُبھی ہوتی، جیسے آدمی جنگل میں چل رہا ہو۔ بسری بیا دیں میرا جنگل ہیں۔ آخر یہ جنگل شروع کمال سے
ہوتا ہے۔ نہیں میں کمال سے شروع ہوتا ہوں اور وہ پھر جنگل میں تھا۔ جیسے جنگل کی انتہا
تک پہنچتا پاہتا ہو، جیسے اپنا شروع تلاش کر رہا ہو۔ اندر ہیرے میں چلتے چلتے کوئی سور
منطقہ آتا تو مٹھکتا۔ مگر پھر اگر پڑھ جاتا کہ وہ تو اس ساعت تک پہنچنا چاہتا تھا جب اس
کے شعور سے آنکھ کھو لیتی۔۔۔ مگر وہ ساعت اُس کی گرفت میں نہیں آرہی بھتی۔ جب کسی
یاد پہ انگلی رکھی تو اس کے عقب میں یادوں کے دل بادل منڈلاتے نظر آتے۔ پھر وہ بول

چلا کہ اس کی یاد کے حساب سے روپ نگہ میں سب سے پہلے کون سا واقعہ ہوا تھا۔ مگر اس سیتی
کا ہر عمل صدیوں میں پھیلا نظر آیا۔ روز و شب کا قابل وہاں کتنا آہستہ کردہ تھا جیسے گز نہیں
رہا، رکا کھڑا ہے۔ جو شے جہاں اگر بھر گئی سوبس بھر گئی۔ جب بھلی کے کھیبے پہلی پہل آتے
تھے اور سڑکوں پر جہاں تمہارے گئے تھے تو یہ کتنا انقلابی واقعہ نظر آتا تھا۔ پورے
روپ بکھر میں ایک سنتی دوڑ گئی۔ لوگ چلتے چلتے ٹھنکتے، سڑکوں کے کنارے پڑھتے
بلے آہنی ٹھیکیوں کو جیرت سے دیکھتے۔

« تو روپ نگہ میں بھلی آر گئی اے؟ »

« نہیں۔ »

« میر سے مرسوں؟ »

« تیر سے مرسوں۔ »

دن گزر تے گئے، تجسس کم ہوتا گیا۔ ٹھیکیوں پر گرد کی تینیں جھتی چلی گئیں۔ وقتہ رفتان
پر اتنی ہی گرد جم گئی جتنی ان نکروں کی دھیریوں پر ہوئی جعلے وقت میں سڑکوں کی مریت کے
لئے یہاں ڈالی گئی تھیں۔ لگبھر ڈالنے والوں نے انہیں فراموش کر دیا اور وہ روپ نگہ کی
گرد میں اٹے لینڈ سکیپ کا حصہ بن گئیں۔ اب یہ سمجھیے جیسی اس گرد میں اٹے لینڈ سکیپ کا حصہ
تھے۔ لگتا کہ سدا سے یہاں پڑتے ہیں، سدا یہاں پڑتے رہیں گے۔ بھلی کی بات آئی گئی ہو
پکی تھی۔ روز شام پڑتے الائین جلانے والا کاندھے پر سیر گھی رکھے ہاتھ میں تیل کا کپالنے
نہدار ہوتا اور جا بجا لکڑی کے سلونوں پر نصب اور دیواروں کی بلندی پر ٹھکی ہوتی
الائینوں کو روشن کرتا چلا جاتا۔ یہی وسنتی سنجا ہو گئی۔ دیا بال دے» وسنتی سانوں
ریگت، یہ صویں صورت، ما تھے پرندیا، مل دلی ساطھی، نینگے پیروں، مچپ تھپ کمرتی
ٹیلیوڑھی پر آتی۔ طاق میں رکھے دیے میں تیل بھی ڈال کے جلاتی اور اُسے پیروں اندر چلی
جاتی، بغیر اُس کی طرف دیکھتے ہوتے کہ وہ اپنی ٹیلیوڑھی پر کھڑا اسے نکتار ہتا۔ چھوٹی بندیا

میں بھگت جی میلے چکیٹ ڈیوٹ پر رکھے دیے میں ایک پل کڑ و اسیں ڈال کے اسے جلاتے اور سمجھ لیتے کہ ان کی دکان سور ہو گئی۔ انہیں کی دکان آگے نالی کے آگے مردم شال جلا کر خواپنے کے باریگاڑ دیتا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اواز رکھتا۔ «سو نہ کسے بتا شے،» مگر سب سے تیز روشنی لا لہ ہر دیال صرافت کی دکان پر ہوتی جہاں چھت میں لکھے ہوئے یہ پ کی روشنی دکان سے تخلی کر سڑک پر تھوڑا اجلا کر دیتی۔ روشنی کی پونچی اس نگر میں لیں آئی ہی اور یہ بھی کتنی دیر دکانیں ایک ایک کر کے بند ہوتی چلی جاتیں۔ ڈیوٹ ھیوں کے ماقول میں جملہ لاتے دیتے مند ہوتے چلے جاتے اور آخر کوچھ جاتے۔ پھر یہ کسی کسی بکٹ پر لکڑی کے ستون پر نصب لالیٹن ٹھٹما قی رہ جاتی۔ باقی انہیں ہی انہیں ایسا اندھیرا۔ یوں اس انہیں سے میں دیکھنے والی آنکھوں کو بہت کچھ نظر آتا۔

«بی امام! یہ چھلی جمعرات کی بات ہے۔ دونوں وخت مل رستے تھے۔ چوپال کے پاس سے گزری تو ایسے لگا جیسے کوئی عورت رور ہی ہے۔ ادھر دیکھا اور ہر دیکھا کوئی بھی نہیں۔ چوپال کے پھانک کے پاس ایک کالی بلی بیٹھی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اسے دھنکا دیا۔ آگے جو گئی تو اسے میں کیا دیکھوں ہوں کریم والی یواکی دیوار پر وہی بلی میں نے پھر سے دھنکا دیا۔ وہ دیوار سے اندر کو دیکھی۔ آگے چل کے اوپنے کنوں والی گلی سے تخلی کو اسے بی امام تین کریوچھرو ہی بلی۔ لا لہ ہر دیال کے چبوترے پر بیٹھی ایسے رور ہی تھی۔ جیسے عورت رور ہی، ہو۔ میرا جی سن سے رہ گیا۔»

«اللذیں پناہ حم کرے۔» بی امام نے تشویش سے کہا اور چپ ہو گئیں۔ گور حم کہا۔ اس سے دوسرے تیسرا دل شریف نے آگہ دوسری خبر سناتی۔
«لے بی امام! محلے میں چڑھے بہت مر سہے ہیں۔»

«اچھا؟»

«ہاں، میں گھوڑے کی طرف سے گزری تو دیکھا کہ ڈھیروں مر سے پڑے ہیں۔»

پہلے چوڑے مرے، پھر آدمی مرنے لگے۔ باہر سے آتی ہوتی آواز رام نام شبیہ ہے۔
”اری شریف دیکھ تو سی کون مر گیا۔“

”بی اماں! پیارے لال کاپوت جگدیش مر گیا۔“

”ہستے ہستے باوہ تو کہڑیں جوان تھا کیسے مر گیا۔“

”بی اماں اس کے گلائی نخلی تھی۔ گھنٹوں میں چٹ پٹ ہو گیا۔“

”گلائی؟ اری بخخت کیا کہ رہی ہے۔“

”ہاں بی اماں! سچ کہہ رہی ہوں۔ طاغون۔“

”بس بس زبان بند کر جھرے گھر میں اس ستیاناسی نیماری کا نام نہیں لیا کرے تے۔“
گھنٹی جگدیش کے نخلی، پھر نیڑت ہر دیال کے نخلی، پھر مصراجی کے نخلی۔ پھر لوگوں کے
نخلتی ہی پلی گئی۔ جنازہ ایک گھر سے نکلا، پھر دوسرا گھر سے نکلا، پھر گھر گھر سے نکلا۔
بی اماں نے اور نشریعن نے مل کر دس تک لکھتی گئی۔ پھر وہ گھر بڑا لیں۔ ایک دن میں کتنے
گھروں سے جنازے نکل گئے۔ شام ہوتے ہوتے گلی کوچے سنسان ہو گئے۔ نہ قدموں کی آہٹ
نہ ہنسٹے بولتے لوگوں کی آذانیں۔ اور تو اور آج پھر تھی کہ ہار موئیم کی بھی آواز سنائی نہیں دے
رہی تھی جو جاڑے گئی، برسات روز رات کو بیٹھک میں ہار موئیم کو لے کے بیٹھ جاتا اور
تانا رکھتا:

لیلی لیلی پکاروں میں بن میں

لیلی موری لیسی مور میں میں

جب صحیح ہوتی تو بستی کا زنگ ہی اور تھا کوتی کوئی دکان کھلی تھی، باقی سب بند کچھ
گھروں میں تا لے پڑ کر تھے، کچھ میں پڑ رہے تھے کسی گھر کے سامنے بیلی کھڑی تھی، کسی
گھر کے سامنے اکٹھا۔ لوگ جا رہے تھے اتگھ خالی ہو رہا تھا نگہدوں مرح خالی ہوا۔ کچھ نگرے
مکل گئے، کچھ دنیا سے گز رکھے۔

”بی اماں! ہندو زیادہ مر رہے ہیں۔“

”بی بی! ہیئتی میں مسلمان مرتے ہیں، ٹھاکور ہیں ہندو مرتے ہیں۔“

لگپچھر طاون نے ہندو مسلمان میں امتیاز ختم کر دیا۔ لکھ کی آوازوں کے جلوہ میں نکلتے ہوئے جنائزے بھی زور پکڑ گئے۔

”ہو! اُکہ کوروک کے رکھو۔ یہ بار بار باہر جاتا ہے۔“

”بی اماں! یہ لڑکا میری نہیں ستنا۔“

”اچھا بخمل کے دیکھے، اس کی طالگیں توڑ دوں گی۔“

لگ کسی دھمکی نہ ساں پڑا۔ نہیں کیا۔ رام نام سنتیہ کی آواز آئی۔ اور وہ زن سے باہر پڑ گئی۔ پر۔ جنائزہ جب گزر جانا تو سوگوار عزیز میں ایندھن سنھالے میں کرتی ہوئی گئی تریں۔ ان کے گزد جانے کے بعد سڑک کتنی ویران نظر آتی تھی۔ شریفین روڑی ہوتی آئی اور اسے پکڑ کر اندر بے جاتی۔

ٹھیٹھی کرتی ایک بیلی آئی اور ڈیوڑھی کے آگے آگ کھڑی ہو گئی۔

”اری شریفین دیکھ تو سی، ان قیامت کے دنوں میں کون ہماں آیا ہے۔“

شریفین گئی اور آئی۔

”بی اماں! ادا پور سے ماہوں ابا نے بیلی بھیجی ہے۔ کہلو ایسا ہے کہ سب کو لے کر بخمل آؤ۔“

لی اماں سیدھی بڑے کمر سے میں گئیں جہاں ابا جان سب سے الگ دن دن بھر مصل

پہ بیٹھے رہتے۔

”بیٹھے ناصر علی! تمہارے ماہوں ابا نے بیلی بھیجی ہے۔“

اب جان نے تامل کیا۔ پھر لوٹے:

”بی اماں! حضور رسالت آپ نے فرمایا کہ جو موسم سے پھاگتے ہیں وہوت

ہی کی طرف بھاگتے ہیں۔“

پہلی خالی آئی تھی، خالی والپس گئی اور ایجادا نے چینی کی پیالی میں رعفران گھولہ، فلم پاک کر کے اس میں ڈوبیا اور ایک دبیر کا غذ پر جل حروف میں لکھا:
”لی خست، اطہنی بہر ساحروں بباء الحاطم، الْمُحَمَّدُ الْقَاطِمُ“

والعن و الحسین یا علی یا علی یا علی“

پھر یہ کاغذ فیور ہی پر جا کر چھاٹکا پر چھاٹکا یا اور والپس مصلے پر آب میٹھے۔
ڈاکٹر جو شی کاشفا خالنے سے نکلا دا اور کسی کے گھر پر پہنچتا ہے ایک واقعہ ہوا کرتا تھا۔
مگر اب تو ڈاکٹر صاحب وقت بے وقت لگے میں آمد لئے عنودار ہوتے۔ کبھی اس گلی میں
کبھی اُس گلی میں۔ ڈاکٹر صاحب روپ مگر کے میجا نہ کہنے والے کہتے تھے کہ ان کے مقابلے
کاڑا کترڈلی کے بڑے ہسپتال میں بھی نہیں ہے لیکن اب میجا کاڑا ورگھٹ رہا تھا، موت
کا زور پڑھ رہا تھا۔ خود ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے لکھنی نکلی اور ڈاکٹر صاحب کے
درلیختے دیکھتے پران چھوڑ گئی۔
”ڈاکٹر کی بھی بیر مر گئی۔“

”بہبے!“

بھگت جی کی دکان پر بیٹھے لوگ اس سے زیادہ کچھ نہ لسکے۔ چروں بھی مل وید کی دیا
اور حکم بند سے علی کی حکمت سے پہلے ہی ہے میں اعتیار اٹھ گیا تھا۔ اب ڈاکٹر جو شی کی
میجا کی بھی اپنا اعتیار کھو بیٹھی۔ موت اب ایک اُنل جیفیت تھی۔ مرنے والے خاموشی سے
مر رہے تھے۔ جنازہ اٹھانے والے تھکے تھکے نظر آتے۔

وہ خود کتنا تھک گیا تھا۔ جنازہ گئے رہا تا اور وہ اسی طرح کھڑا رہتا اور خالی سڑک
کو تکتا رہتا۔ اس کے گھر کے سامنے کی سڑک اب کتنی ویران نظر آتی تھی۔ دکانوں اور مکانوں
میں بالعموم تک پڑتے تھے۔ وسنتی کے گھر کے دروازے میں تالا پیٹھ چکا تھا۔ کسی کسی دکان

لایپٹ کسی وقت تھوڑا کھلانظر آتا، پھر جلد ہی بند ہو جاتا۔ وہ تعقل و روازوں، بند کو اٹوں اور سوئی سروک کو دیکھ دیکھ کے تحکم جاتا اور شریفین کے لفاضے سے پہلے ہی واپس اندر چلا جاتا جہاں ایک خاموشی سی چنانی رہتی۔ ابا جان سب سے الگ مت و ذیست کے عادات سے بے نیاز مصلے پر بیٹھے تبعیج پھیرتے رہتے۔ بی اماں پنگ پر بیٹھی کچھ بینتی پر وقی رہتیں۔ آگاہ گاہات اسی سے باش ریفین سے اب حیرت ان کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی پھر بھر بھی اور خوف بھی۔ دوسری آنکھوں میں بھی اب نہ حیرت تھی تھ خوف۔ وبا کو جیسے ایک فائموں دائرہ حقیقت کے طور پر سب نے قبول کر لیا تھا۔ ہاں تک ایک دو زیب اماں صبح کو اس طور جائیں کہ بدن ان کا کانپ رہا تھا۔ اسی عالم میں انہوں نے نہایت پڑھی اور دیرنک سجدے میں پڑی رہیں۔ جب سجدے سے سڑھا یا تو چھریوں پھر اچھرہ آنسوؤں میں تربت تھا پھر انہوں نے آنچل منہ پر کھکھ لکھی آفاز کے ساخن درونا شروع کر دیا۔ ابا جان نے مصلے پر بیٹھے بیٹھے عنور سے بی اماں کو دیکھا۔ اُنھوں کہ قریب آئے ہیں اماں کیا ہاتھ ہے؟

”بیٹھے امام کی سواری آئی تھی۔“ رکن، پھر لوگوں ”ایسی روشنی جیسے گیس کا ہنڈا جل گیا ہو۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے کہ مجلس کہہ و۔“

ابا جان نے تامل کیا۔ پھر کہا:

”ہی اماں! آپ کو بشارت ہوئی ہے۔“

بشارت کی خبر شریفین کی زبانی گھر گھر پہنچی۔ ہر اس گھر سے جس میں تالا نہیں پڑا تھا۔ پیدائش آئیں۔ مجلس ہوتی اور بہت رقت ہوتی۔

”اے بی اماں! آپ نے کچھ تماں نخواست ماری بیماری طلب کئی۔“

”اری کچھ کہہ۔“

”ہاں بی اماں! ڈاکٹر جو شی نے بتایا ہے۔“

”اللہ تیرا شکر ہے۔“ اور بی اماں کی آنکھوں میں پھر انسوامنڈا اسے۔ جب سجدے سے

انہوں نے سراخایا تو جھیر لوں بھرا چھرو پھر انسوؤں میں تربیز تھا۔

پیلیاں جس طرح لدی چند ری گئی تھیں اسی طرح لدی چندی والیں آئیں۔ مخطوطی مخطوٹی
دیر بعد ایک بیان کہ چرخ چرول کہتا آئتا اور ایک اور عقول گھر کھل جاتا۔ عقول مکان کھل رہے
تھے اور گھر کے اندر کے چھپھڑے گودڑے باہر ڈھیر لگا کہ جلاتے جا رہے تھے۔

اب شام تھی۔ دور و سنتی کے گھر کے آنکھ سے دھات کے چھوٹے بڑے برتنوں کی
کھنکھناہیں، صاف سنائی دے رہی تھیں۔ مندر سے آتی گھنٹیوں کی آوازوں کے سچے ایک
مالوس آواز سنائی دی تھی۔ ری و سنتی، سنجھا ہو گئی، دیا بال دے، اور و سنتی اسی طور
نئے پروں ڈیوڑھی پر آئی، نئے دیوے میں نئی بنتی ڈال کر جلانی۔ والیں جاتے لگی تھیں۔
کہ سڑک پار کر کے وہ اس کے قریب گیا در و سنتی!“
و سنتی نے مٹکر لے سے دیکھا اور مسکرا لی۔

”آگئی تو؟“

”ہمیں۔“

وہ اور قریب آگی۔ اس کی نئی بائیں ہوئے سے چھوتے ہوتے ہوتے نرم بیٹھے لجھے میں بولا۔
”آگھیلیں ہا۔“

و سنتی مٹھکی۔ پھر ایک سامنہ بھر کی ”چل مسلے“ کے چھورے، اور بھاگ کہ اندر
چل گئی۔

و سنتی سے بھر کی کام کر خوشی سے سرتشار وہ والیں گھر لگی اور دیر تک اپنی پوری
میں مٹھاس گھلتی محسوس کرتا رہا۔

یہ آباد گھر پھر سے آباد ہو گئے تھے اور چھوٹی بزریاں میں پھر فیسی ہی گھما گھمی تھی۔ پھر
بھی اب جہاں تمہار کھا پئے نظر آتے اور چھر سے یہاں وہاں سے کم کھاتی دیتے۔ پنڈت ہریال
اپنے گھر کے چھوڑتے پہ اور صراحی اپنی دکان کی منسد پر کھان دکھاتی دیتے تھے اور جگدیش کھاں

تھا جو روز رات کو چرخی کی بیٹھک میں جائکر ہار موئیم سیکھتا تھا۔ پنڈت ہر دیال کے بیٹے سوہن کا گھٹا ہوا سر ہفتون اعلان کرتا رہا کہ وہ باپ کے سوگ میں ہے۔ مگر پھر سوہن کے سرپا بال آتے چلے گئے اور چھوٹی بزریاکے کھانے پھرتے چلے گئے۔ چھراتے ہی لوگ جیسے کوئی کم نہیں ہوا ہے اور ولیمی ہی روتھ جیسے یہاں کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔ چرخی کی بیٹھک میں پھر پھر رحمت لگی تھی۔ آدمی اور ہر راستہ کا ہار موئیم بجتا اور رکانے کی آواز دوڑتا جاتی۔

رات پھر بیلی پر بڑی رہتی ہے بلوں

اپنے پہلو میں دیانتے درد دل

درد دل بھی کیا کوئی معشوق ہے

جس کو دیکھو بنتلا نے درد دل

”چرخی سالے تیرے تو مرے ہو گئے۔“

”یکسے؟“

”کہماں تیری بیٹھک کے بالکل براہ کھڑا ہوا ہے۔ سالے تو تواب بھلی کی روشنی میں ہار یوم بجا یا کہرے گا۔“

کھینچی کرایک زمانے سے گردیں رئے ملے پر بڑے تھے، اچانک کھڑے ہو گئے تھے لوگ چلتے چلتے مشھکتے، نظریں اٹھا کر اپنے کھبموں کو دیکھتے اور آنے والی نئی روشنی کا تصویر کر کے دنگ رہ جاتے۔

”کھویں ہیں کہ بھلی میں بہت روشنی ہو وسے ہے۔“

دو بس ایسا تجھ لوکہ دن نکلا ہوا ہے۔“

”بھی انگریز بھی کمال ہے۔“

مگر مزدور کھبموں کو کھڑا کر کے پھر نظاروں سے او جھل ہو گئے۔ دن گزورے چینے گذے، پھر وقت گرا رتا ہی چالا گیا۔ کھبیز کردا کوڈ ہو کر پھر لینڈ سکیپ کا حصہ بن گئے۔ لگتا تھا کہ

گھاڑے نہیں کئے ہیں، زمین سے وگے ہیں۔ اڑتے اڑتے کوئی فاختہ کوئی نہ کھٹ بٹھیا
دم بھر کے لئے کسی کھیپ پا اترتی۔ لگر شاید اس کی آہنی صورت سے بیزار ہو کہ جلدی اٹھاتی
ہاں کوئی چیل آبھی تو دیر تک بیٹھی رہتی۔ لگر چیلین میٹھوں پر بیٹھنا زیادہ پسند کر تی تھیں پرالا
کی اوپنی مٹھی پر جو چیل آبھی وہ پھر بیٹھی ہی رہتی۔ لگناک جگ بیت جائے گا اور وہ یہاں سے
نہیں اڑتے گی یہ مٹھی کچھ اتنا دزمانہ سے پلا فی ہوئی، کچھ چیلین کی میٹھوں نے اسے پرانا بنا
دیا۔ لگر بڑی حوصلی کی بے جیاں پر ان ہونے سے پہلے لٹ پھوٹ گئیں۔ یہ نیروں کا کارنا مہ تھا
بات یہ ہے کہ جس طرح چیل ہر مٹھی پر نہیں بیٹھتی اسی طرح بندر بھی ہر منڈیر پر نہیں دندلتے۔

اس لگر کی کچھ مٹھیاں چیلیں کو بھائی تھیں، کچھ منڈریں بندروں کو پسند آگئی تھیں۔

بندروں کا عجیب طور تھا۔ آتے تو آتے ہی چلے جاتے۔ جلتے تو اس طرح جلتے کہ
کوئی مٹھوں پر تو کیا کہ بیلا کے پاس والی امیلوں پر بھی نظر نہ آتے۔ چھتیں سنسان، منڈریں
ویران۔ صرف اوپنے کو مٹھوں کی شکست بے جیاں ہے یاد دلائیں کریں اور پنچ کوٹھے کبھی بندروں
کی زدوں تھے لگر اس شام کیا ہوا تھا۔ گلے سے گزرتے گزرتے اُسے ایسا رکا۔ جیسے اس
کے سر پر ایک منڈری سے مقابل والی منڈری پر کوئی گودا ہے۔ نظر اٹھائی تو کیا دیکھا کہ
بندروں کی ایک قطار منڈری منڈری چلی جا رہی ہے۔ یہاں سے بندروں کے منہ سے نکلا اور
دل دھک سے رہ گیا اور دوسرے دل جب وہ صبح کو سوکرہ اٹھا تو گھر میں اور گھر سے
باہر شور چاہوا تھا۔ سنگن میں رکھی ہوتی چیزوں بالٹ پھوٹ گئی تھیں یا غائب ہو گئی
تھیں۔ ایک بندرا می کا دو پیڑھے اڑتا تھا اور سب سے اوپنے والے کوٹھے کی منڈری پر
بیٹھا سے دانتوں میں دیا کر کر پر لیا تھا۔

بندر جانے کس کس بستی سے کس کس جنگل سے چل کر آتے تھے۔ ایک قافلہ دوسری
قافلہ، قافلہ کے بعد قافلہ۔ ایک منڈری سے دوسری منڈری پر، دوسری منڈری سے تیسرا
منڈری پر۔ بھرے سنگنوں میں پاک چھپ اترتا، چیزوں کو اچک یہ جاوہ جا نہ تو ایتھی

نے چندہ جمع کر کے چھنے خریسے اور گھڑ کی ایک بھیل پسند و لئے تالاب میں جا کر کہ برسات کے سوا سارے برس میں خشک پڑا رہتا، چھنے بکھرے، بیچ میں گھڑ کی بھیل رکھی سا تھیں پھوٹے پھوٹے ڈنڈے بندر کو دتے پھاندتے آئے، چھتے اناب شناپ کھاتے۔ گاؤں میں بھر لئے۔ بھیل پیکے ایک بھیلی سوبندر فناہ شروع ہو گیا۔ ڈنڈے تو موجود ہی تھے۔ دیکھتے دیکھتے سب بندر لٹکنے بندر ہو گئے جس نے بھیل اٹھاتی اُسی کے سری ڈنڈا پڑا۔ بندروں نے دلوں ہفتون دھو میں چائیں شاخوں، لوٹ مار اور بالآخر غاثہ جگی، اس کے بعد غائب پختیں بھر سنسان، منڈیوں میں پھر ویلان۔ لگد جب بھیل آئی ہے ان دنوں وہ بستی میں تھے اور منڈیر منڈیر نظر آتے تھے کبھی کہ موسموں کے ستم سوتھے سوتھے منظر میں مل مل گئے تھے۔ اچانک پھر لوچ کا مرکز دین گئے۔ مزدور بھی بیٹھیاں کاندھوں پر اٹھاتے موندار ہوتے۔ کھبیوں کے اوپری سروں پر صلیبی انداز میں سلاخیں لگیں، سلاخوں میں سفید سفید چیلی کی سی ٹکلیں درست ہوئیں۔ ایک کھبی سے دوسرے کھبی تک، دوسرے کھبی سے تیسرا کھبی تک تار تانے لگئے اور سڑک سڑک کھبیوں پر تار کھنچنے چلے گئے۔ فضایاں ایک نیا واقعہ طور پر ہو گیا تھا اور پہنچوں کو پنج ڈکانے کے لئے نئے ٹھکانے میسرا گئے تھے۔ روپ نگر کے پہنچے اپ منڈیوں اور درختوں کی شاخوں کے محتاج نہیں رہے تھے۔ کوئے منڈیوں پہ بیٹھے کائیں کائیں کرتے تھک جاتے تو وہاں سے اڑتے اور کسی تار پر بھوتے لگتے۔ کوئی نیل کنٹھ کوئی شام پھرڑ بایا، کوئی دھوپن پڑیا۔ اڑتے اڑتے دم لینے کے لئے کسی تار پر اُتھاتی۔

پہنچوں کی دیکھا دیکھی ایک پند نے چھوٹی بڑیا کی ایک منڈی سے چھلانگ لگائی اور تاروں پر بھول گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پیٹ سے زین پر آ رہا۔ ایک طرف سے بھگت بھی، دوسری طرف سے لاہ مٹھن لال اپنی دکان سے اُٹھ کر دوڑتے۔ حیرت اور خوف سے دم توڑتے بندر کو دیکھا چلا تھے:

چندی نے لیک جھپک کنوں پہ جا ڈول ڈالا، پانی بھر کے لا یا اور پورا ڈول بند رہی
انڈیل دیا مگر بند کی آنکھیں بند اور بدن ساکت ہوتا چلا گیا۔

اس پاس کی منڈپیوں پر جاتے کہاں کہاں سے بند رامنڈ آتے تھے اور سڑک
بیچ ساکت پڑتے ہوتے اپنے رفتی کو دیکھ دیکھ کے سورچار ہے تھے۔ پھر گلی محلوں سے
لوگ دوڑتے ہوتے آتے اور مرے ہوتے بند کو حیرت سے شکنے لگے۔

«کون سے تاریخ رکھتا تھا؟»

«اس تاریخ، چندی سب سے اوپر والے تاریخ طرف اشارہ کرتا۔

«تو بچلی آگئی؟»

«ہاں جی آگئی۔ ادھر آدمی نے تارکو چھوڑا اور ادھر ختم۔»

دوسرے دن پھر ایک بند تاروں نپر کوڈا اور دھپ سے زین پر آ رہا۔ پھر بھگتی ہی
اور لالہ مٹھن لال لیک کر دیاں پنچ اور پھر ہنسی پانی سے بھرا ڈول لے کر دوڑا مگر بند
دیکھتے دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔

بندروں میں پھر ایک کھیلی پڑی۔ دور دور کی چھتوں سے کو دتے چھانتے آتے۔
بیچ سڑک پر پڑتے مردہ بند رکاویک وحشت کے ساتھ دیکھا اور بساط پھر شور چایا۔
بندہ ہمار تھک کر چپ ہو چلے تھے۔ بہت سے والپن ہولے لکھے کہ ایک موٹا
مازہ بند پیڑت ہر دیاں کی اوپنجی بی بی مٹڈپر پر دور سے دوڑتا ہوا آیا غصے سے منہ سرخ، یاں
بدن پتیروں کی طرح کھڑے ہوتے۔ کھجی پچھلانگ لگا گئی، کھجی کو اس زور سے بلا یاک
وہ پودے سے پیڑ کی طرح ہل گیا۔ پھر وہ اوپر چڑھا اور پوری قوت کے ساتھ تاروں پر چمداو
ہوا۔ تاروں پر کو دتے ہی لٹک گیا۔ کھڑا بھر لٹکا رہا، پھر اور ہوا ہو کے زین پر گرد پڑا بھگتی ہی
لالہ مٹھن لال اور چندی تینوں نے پھر ایسا اپنا فرض ادا کیا۔ بند رنے پانی پڑنے پر سکھیں کھولیں،
بے بی سے اپنے درد مندوں کو دیکھا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

یند پھتوں پھتوں کو دتے پھاند تے آئے۔ لگتا تھا کہ سب سڑک پر اتر آئیں گے،
لگدیں وہ منڈیوں پر منڈلاتے رہے، چھنٹتے چلاتے رہے پھر ایک دم سے چپ ہو گئے
جیسے کسی خوفتے اینہیں آیا ہو۔ پھر منڈیوں میں غالی ہونے لگیں۔

شام ہو رہی تھی، موٹا بندرا بھی تک سڑک پر پڑا تھا۔ آس پاس کی کسی منڈیر پر
کہیں کوئی بندرا نہیں تھا، روپ تک راپنے تین بندروں کی بھینٹ دے کر بھل کے زلنے
میں داخل ہو گیا اور نیدر ایسے غائب ہوتے کہ ہفتون ٹک کسی منڈیر، کسی چھت، کسی درخت
پر کوئی بندرا دکھائی نہیں دیا اور تو اور کا لے مندر کے بیٹھ پیل پر بھی، جہاں ہر سو سم،
ہر دنوں میں بندرا شاخ شاخ اچکے لکھتے نظر آتے تھے، سنا تھا۔

روپ تک کار بجن بن اسی کا لے مندر سے بڑا فوج ہوتا تھا۔ دیواروں اور گنبد پر
اتنی کافی جگنی تھی اور جم کے کالی پڑھنگی بھی کہ پورا مندر کا لاکار دکھائی پڑتا تھا۔ اندر
باہر سب ستسان جیسے صدیوں سے بہاں نہ سنکھ پہنکا ہو، نہ کسی پسجارتی نے قدم رکھا ہو۔
جتنا دُسخا مندر تھا اتنا ہی اوسچا اس کا پیل جس کی ٹھیکوں پر سدا بندرا جھوٹتے رہتے ہوئے
ان دلوں کے جب ادھر کوئی لمبی رسی جیسی دم اور کا لے منہ والا لگوں آنکھ تک اُس کے
دیکھتے ہی بندرا قاتب ہو جاتے کا لے مندر سے آگے کر بلاؤ کی کہ سال میں ایک عاشورہ
کے دن کے سوا بیران دکھائی دیتی جیسے پنج پنج کر بلاؤ ہو۔ اس سے مٹوڑے فاصلے پر ایک طیلہ
جس پر عمارت کے نام ایک بڑی کھڑکی رہ گئی تھی اور قلعہ کھلا تھی۔ آگے راون بن بھل اجاڑ
دور تک بیلان ہی میدان جس کے پچوں زیج ایک پسجارتی بڑا کا پڑھ کر جھٹا اتحادیستی سے
ٹکل کر بندرا اور جیسی کے ساتھ گرمی کی دوپر دن میں گھومتا پھرتا جب وہ اس طرف
آنکھ تک اور کا لے مندر کی سرحد کو پار کر لیتا تو اسے لکھا کر وہ کسی دوسرے برا عظم میں داخل
ہو گیا ہے۔ کسی بڑے جبکھل میں جہاں پتہ نہیں کس گھر ہی کس علوفہ سے مذہب پھر ہو جائے،
اور اس کا دل دھک دھک کرئے گلتا۔

کالے مندر والے بندروں سے شاد آباد پیل سے گورتے گورتے وہ ٹھٹھ کا سیارہ
اس سے آگئے کچھ نہ کہہ سکا۔

«کیا ہے ہے ہے؟» جیب نے بے پرواہی سے پوچھا۔

«آدمی۔» اس نے فڑی ہوتی آواز میں کہا۔

«آدمی اکھاں؟» جیب اور بندوں دلوں ایک دم سے چونکے۔

«وہ۔» اس نے قلعہ کی طرف انگلی اٹھاتی جہاں ایک اکیلا آدمی چلتا نظر آ رہا تھا۔

اس نے جن بن میں آدمی اکیلوں کیسے؟ آدمی ہی سے یا۔۔۔ مگر خود آدمی کے ہوتے کا خوف یہ پایا تھا۔ میں وہ ایک دم سے اللہ بیروں بھاگ کھڑے ہوئے۔
بندوں تو اسی ٹھہر میں رہتا تھا اور شریف بوا کا پوت تھا جیب سے یارانہ تھا۔ دلوں
کے سامنے اس نے لکھنی آوارہ گردی ہاتھی دشت نور دی کی تھی۔ مگر صابرہ کے آنے کے بعد اس کی آوارہ گردی میں فرق پڑتا چلا گیا۔

صابرہ، پہلے تو اس نے اس کا صفت نام سنا تھا جب خال جان گاؤں بیار سے خط آتا اور اس میں لکھا ہوتا کہ طاہرہ اور صابرہ اچھی میں سب سلام کرتی ہیں۔ خال جان گاؤں بیار میں رہتی تھیں کہ خال جان، جو بی اماں کے بنتی تھے، وہی ملازم تھے۔ مگر ایک دن تاریا خال جان کے دنیا سے اٹھ جاتے کہ اسی نے روٹی پکاتے پکاتے تو الٹ دیا اور راٹھ کھڑی ہوئیں۔ بی اماں میں کم کہہ رہیں۔

بین اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سامان اور سواریوں سے لدا پھنڈا اور جاروں طرف سے چادر سے تناہوا الٹھر کے پھاٹک کے سامنے آ کر رکا۔ ابا جان ایک بلی چادر سے کہہ باہر آئے۔ ایک کو تابا سے پکڑا ایسا، ایک کو تاخود پکڑا۔ ایک سمعت میں تو اس طرح پرده کیا۔ دوسری سمعت میں کوئی آدمی چلتا پھر تا نظر نہیں آ رہا تھا پھر اس کے کاپردہ اٹھا۔ خال جان اُتریں۔ خال جان کے سامنے دو لڑکیاں، ایک طاہرہ یا جی اور دوسری صابرہ جسے خال جان

بلوکہ کہ پکار رہی تھیں، بس لگتا تھا کہ اس کے پڑاپڑ کی ہے۔

پچھے تو صابرہ اس سے الگ الگ رہی۔ وہ جھینپا جھینپا ساساں سے دوسرپھرنا رہا مگر سکھیوں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر جھکتا جھکتا اُس کے قریب آیا اُو سلوکھلیں۔ «میاں ذا کر، ابا جان داخل ہوتے ہوئے بوئے لگتا ہے کہ آج بھی یہ لوگ سونے

نہیں دیں گے۔»

«جی،» وہ ہر طریقہ اک جیکھ سے نکلا۔

«میاں یہ لوگ جلسہ کر رہے ہیں یا پلٹریازی کر رہے ہیں۔»

«ابا جان تحریکوں میں یہی ہوتا ہے جو شہ میں لوگ یہ قایو ہو جاتے ہیں۔»

«دیکھا کہا، تحریک؟ یہ تحریک ہے جو بیٹے کیا، تم نے تحریکیں دیکھی، نہیں ہیں۔ تحریک خلافت سے بڑی بھی کوئی تحریک ہوتی ہے اور مولانا محمد علی، اللہ اللہ اجنب بولتے تھے تو لگتا تھا کہ انکار سے ہیں رہے ہیں مگر مجال ہے کہ کوئی کلمہ تہذیب سے گہا ہوا ہو۔ خیروہ تو مولانا محمد علی تھے، ہم نے تو کبھی کسی رضا کار کو بھی تہذیب سے گہا ہوا ہو۔ نہیں دیکھا۔ انکیز کوہرہ یاد کہا اور بات ختم کر دی۔ ابا جان چیپ ہوتے۔ پھر جیسے یادوں میں کھوئے ہوں، بڑی بڑی نے لگائے، اس بڑگ سے ایک بھی خطا ہوتی کہ جنت البقیع کے معاملے میں این سعود کی حمایت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ اُس کے اس گناہ کو معاف کرے اور اُس کی قبر کو نور سے بھر دے۔ بعد میں وہ خود بھی اس حمایت پر بہت پچھتا ہے تھے۔» وہ دل ہی دل میں مسلک لیا، ابا جان بھی خوب میں۔ ابھی تک تحریک خلافت کے حواب دیکھ رہے ہیں۔

«او، تم کیا کر رہے ہو؟»

«خیال تھا کہ صبح کے لیکچر تیار کروں گا لیکن۔»

«اس شور میں کوئی کام ہو سکتا ہے۔» ابا جان نے بات کاٹنے ہوتے کہا۔